R. No. 2186/57 | Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

ٹیلی فون ۔ ۶۹
قیمت فی پرچہ
سالانہ چندہ

۲۲ جنوری ۱۹۶۶ء | ایڈیٹر: آل احمد سرور | جلد ۲۵ ۔ شمارہ ۴

اداریہ

چھبیس جنوری

اس ۲۶ جنوری کو ہماری جمہوریت کی عمر سولہ سال کی ہو جائے گی۔ گویا اس نے اب طفلی سے نکل کر جوانی کی منزل میں قدم رکھا ہے۔ اللہ کرے زور شباب اور زیادہ۔

پچھلے سال اس موقع پر ہمیں اپنا معمار اعظم جواہر لال نہرو بے اختیار یاد آیا تھا۔ آج اس کی یاد کے ساتھ اس کے جانشین اور مادر ہند کے سپوت لال بہادر شاستری کی یاد بھی مل گئی ہے جس نے صرف اٹھارہ مہینے ہندستان کی رہنمائی کی۔ مگر اس عرصے میں رزم و بزم دونوں پر اپنا غیر فانی نقش ثبت کر گیا۔ خطرے کے وقت اس نے جس ہمت و جرأت سے میدان جنگ میں ہندوستان کا پرچم بلند کیا تھا، اسی طرح ہمت و جرأت سے تاشقند میں امن و صلح کے لیے جدوجہد کی اور اس جدوجہد کی وجہ سے اس پر اتنا بوجھ پڑا کہ دل کی حرکت بند ہو گئی۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو حق و صداقت اور امن و اخوت کے راستے پر چلنا سکھایا۔ جواہر لال نہرو نے جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیاد ڈالی اور سوشلزم کی منزل کی طرف ہمیں گامزن کیا اور لال بہادر شاستری نے معاملات زندگی میں سیرت فولاد اور شبستان محبت میں حریر و پرنیاں کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس دفعہ یوم جمہوریت کے موقع پر ہمیں ان تینوں کے کارنامے کو سامنے رکھنا ہے اور ان کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

اس دنیا میں جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ہے۔ ہاں جس کی زندگی ملک و قوم یا انسانیت کی خدمت کے لیے وقف ہو۔ وہ مرنے پر بھی زندہ رہتا ہے۔ گاندھی جی شہید ہو گئے، جواہر لال اور شاستری کو موت کے ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔ مگر ہندوستان زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اس کے پاس ایک شاندار نصب العین ہے، اس کی ایک عظیم تاریخ ہے، اس کے وسائل بے شمار ہیں، اس کی طاقت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ ابھی جہالت، غریبی، بیماری کی لعنتوں سے رہائی حاصل نہیں کر سکا ہے۔ ابھی اس کے بہت سے شہری بنیادی ضروریات کو ترستے ہیں، غذا کے لیے ابھی اسے دوسرے ملکوں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، اس کے کھیتوں میں اب بھی بھوک اُگتی ہے۔ اس نے ہر بالغ کو ووٹ کا حق دیا ہے مگر ووٹ اب بھی ذات پات، مذہب، علاقے، زبان سے وفاداری کی بنا پر دیے جاتے ہیں۔ ابھی یہاں خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ ابھی جدید دور کی ضروریات کا احساس عام نہیں ہے۔ ابھی یہاں بہت سے لوگ صدیوں پہلے کے ان خیالات پر جمے ہوئے ہیں جو اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ابھی قول اور فعل میں بڑا فرق ہے۔ ابھی قانون کا احترام نہیں ہے، اس کا خوف ہے۔ ابھی ملک کی رنگا رنگی پر فخر نہیں ہے، ایک بے روح یکسانیت پر اصرار ہے۔ ابھی اقلیتوں سے وہ سلوک عام نہیں ہے کہ ان میں فخر و اعتماد کے ساتھ ملک کی خدمت کا جذبہ بیدار ہو۔ ابھی تمام قومی زبانوں کو ترقی کے مواقع نہیں ملے۔ ابھی تک باتیں بنانے کا مرض عام ہے، عمل کی صلاحیت کم ہے۔ ابھی تک وہ لوگ جو سچے ہندوستانی ہیں، ملک میں سب سے کم تعداد میں ہیں۔

اس لیے اس بار پھر ہمیں اپنے سے عہد کرنا چاہیے کہ ہم اس صورت حال کو بدلیں گے، ملک و قوم کے مفاد کو ذاتی یا علاقائی یا اپنے گروہ کے مفاد

اس شمارے میں

بر سرِ عدم قرار دیں گے۔ ملک سے مطالبہ کم کریں گے اُسے دیں گے زیادہ۔ اپنے اپنے دائرے میں اپنا کام طے کریں گے اور اس کو پورا کرنے میں لگ جائیں گے اپنی تہذیب کو برقرار رکھیں گے اور دنیا کی ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں گے یک جہتی اور امن کے خود بھی پجاری ہوں گے اور دوسروں کو اس راہ پر لائیں گے جذبے کو تہذیب سکھائیں گے اور جوش کو ہوش۔ علم کو انانیت سے بچائیں گے اور عمل کو گرد واڑنے سے۔ سیاست کو اخلاق کے آداب عطا کریں گے اور نوجوانوں کو شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دینے یا شکنجے میں کسنے کے بجائے انھیں ملک کی خدمت کے اس نصب العین سے آشنا کریں گے جو خود بخود ضبطِ نظم سکھا دیتا ہے مگر جس میں تادیب کے بجائے تربیت اور دھمکی کے بجائے دلداری سے کام لیا جاتا ہے۔ ہندوستان زندہ باد۔ جمہوریت پائندہ باد۔

آہ جہاں بانو نقوی

یہ خبر افسوس سے سنی جائے گی کہ یکم جنوری کو جہاں بانو نقوی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ ہماری زبان کے پڑھنے والے ان کے مضامین اور مراسلات سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ مرحوم بڑا پاکیزہ ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان کا ادب کا مطالعہ گہرا تھا اور وہ ہمارے کلاسیکل سرمائے پر بڑی گہری نظر رکھتی تھیں۔ حیدرآباد کی فضاؤں میں خصوصاً اور اردو دنیا میں عموماً ان کی کمی برابر محسوس کی جائے گی۔ ادارہ ہماری زبان اپنے ایک قلمی معاون اور ہمدرد کے غم میں سوگوار ہے۔

ڈاکٹر ہاشمی شعبۂ اردو کے پروفیسر مقرر

لکھنؤ۔ ۱۰ جنوری۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صدر شعبۂ اردو و فارسی (لکھنؤ یونیورسٹی) کو شعبۂ اردو و فارسی میں نئی قائم ہونے والی پروفیسر شپ کے لیے ایگزیکیٹو کونسل نے منتخب کر لیا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر شپ قائم کرنے کا فیصلہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے عرصہ ہوا کیا تھا اور اس سلسلے میں ریاستی سرکار سے کہا تھا کہ وہ پروفیسر کے مصارف کا نصف بار اٹھائے۔ گزشتہ سال ریاستی سرکار اس بار کو اٹھانے پر رضامند ہوئی۔

ڈاکٹر ہاشمی جو شعبۂ اردو و فارسی میں بہ حیثیت ریڈر متعین ہیں چند ماہ سے اردو شعبے کے عارضی پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اب ایگزیکیٹو کونسل نے اپنے حالیہ جلسے میں ڈاکٹر ہاشمی کو مستقل پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کرنے کا فیصلہ دے دیا ہے۔

مرزا غالب پرائز

دہلی۔ ۲۱ دسمبر۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک خصوصی جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اردو کے نوجوان شاعر سید تنظر برنی کو دہلی یونیورسٹی کے پرو چانسلر اور سپریم کورٹ آف انڈیا کے چیف جسٹس جناب پی بی گجندر گڈکر صاحب نے اپنے دست مبارک سے دہلی یونیورسٹی کا "مرزا غالب پرائز" مرحمت فرمایا۔ سید تنظر برنی نے امسال دہلی یونیورسٹی کے بی۔ اے کے تمام طلباء میں اردو کے مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہیں۔

بنگلہ ادب کی تاریخ

ماسکو (تاس) علم السنہ کی سوویت ماہر السنہ توسیتیخ کی کتاب "بنگلہ ادب کی تاریخ" سوویت سائنس اکادمی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بنگلہ ادب کی روایات و کلاسیکی میراث کے تجزیے کے ساتھ ہی عصرِ حاضر کے بنگلہ ادب پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ تاریخ کا آغاز دسویں صدی سے ہوتا ہے جب ایک آزاد زبان کی حیثیت سے بنگلہ زبان کی نشو و نما شروع ہوئی۔ بنگال کے قدیم مسودے "چریا پدا" کا ذکر کیا گیا ہے جو بارھویں صدی کی تصنیف ہے، جے دیو کی شاعری کا ذکر بھی ہے جس کی نظم "گیتا گووندا" کی بڑی اہمیت ہے۔ ٹیگور، سرت چندر چٹوپادھیا اور قاضی نذرالاسلام کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

مخدوم کی خدمات کا اعتراف

اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کے اعزاز میں گزشتہ ہفتہ آندھرا پردیش کی وزارت تہذیبی امور کی طرف سے ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقع پر مخدوم محی الدین کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک شال اور پھولوں کا ہار پیش کیا گیا۔ مخدوم نے اپنی بعض منتخب نظمیں سنائیں۔ آندھرا پردیش کے وزیر کلچرل امور ایم آر اپا راؤ نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ [illegible]

۲۵۰ سال پرانی عربی اور فارسی کی انسائیکلوپیڈیا

آگرہ۔ ۲۰ جنوری۔ آگرہ کے ایک شخص کے پاس ایک کتاب "تاج اللغات" ملی ہے جو عربی اور فارسی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی چھپائی لیتھو کی ہے اور یہ ۲۵۰ سال پرانی ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کی مہر ثبت ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے ہر جلد میں آٹھ سو صفحات ہیں۔ کاغذ کھردرا ہے۔

للت کلا اکیڈمی کے نئے صدر

نئی دہلی ۲۰ دسمبر ۱۹۶۵ء مشہور ادیب اور دانشور ڈاکٹر ملک راج آنند کو یکم جنوری ۱۹۶۶ء سے ۵ سال کی مدت کے لیے للت کلا اکیڈمی کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔

ماہنامہ کتاب کا سالنامہ شائع ہو گیا

اس سالنامہ میں جو ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے آل احمد سرور صاحب سے ایک بھرپور انٹرویو کے علاوہ فراق گورکھپوری، احتشام حسین، رام لعل، ڈاکٹر محمد حسن، خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، شمیم حنفی، حیات اللہ انصاری، اقبال متین، منظر سلیم، احمد جمال پاشا، قاضی عبدالستار، کوثر چاند پوری، زبیر رضوی اور بہت سے مشاہیر کی تخلیقات شامل ہیں۔ سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے ہے۔

مختار ٹونکی

اختر شیرانی کا رومان

"ہماری زبان" مورخہ ۲۱ر جنوری ۱۹۷۵ء اور ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کے شماروں میں اختر شیرانی کے ادبی رسالے "رومان" پر تعارفی نوٹ باصرہ نواز ہوئے۔ مطالعے سے پتہ چلا کہ "رومان" اختر شیرانی اور عاشق بٹالوی کی ادارت میں مئی ۱۹۳۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا اور سید امتیاز علی تاج، سید حسن جعفری اور جوش ملیح آبادی اس کے نگارندگان خصوصی تھے۔ رومان کا ایک شمارہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۷ء میری فائل میں بھی محفوظ ہے جو خصوصی نمبر یا سالنامہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ امر میرے لیے باعث تعجب ہوا کہ عاشق بٹالوی اور مذکورہ نگارندگان خصوصی کے اسمائے گرامی از اول تا آخر کہیں ضمناً بھی دیکھنے کو نہ ملے۔

سرورق سے قطع نظر صفحۂ اول پر اس طرح مرقوم ہے:-

کیوں زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں
(آغا حشر کاشمیری)

سالنامہ

رسالہ رومان لاہور

جنوری ۱۹۳۷ء

مرتبہ

اختر شیرانی

دفتر رومان ۸ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

چندہ سالانہ پانچ روپے قیمت سالنامہ بارہ آنے

۱۴۴ صفحات کی تعداد پر مشتمل اس شمارے کی فہرست مضامین درج ذیل ہے۔

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۔ دائرہ رومان (احباب اور مشاہیر کے خطوط)	مختلف اصحاب	۴
۲۔ سال نو (نظم)	اختر شیرانی	۸
۳۔ غالب کا ایک منظوم خط اور اس کا منظوم جواب۔	ایس۔ ایم۔ اکرام	۹
۴۔ صحیفۂ اختر (مضمون تعارف و تبصرہ)	اختر شیرانی	۱۱
۵۔ اے عشق ہمیں برباد نہ کر (نظم)	اختر شیرانی	۱۳
۶۔ اردو کی رام کہانی اور ہندی انگریزی کی چھیڑ خانی۔	پروفیسر عبدالباسط	۱۷
۷۔ چنار (نظم)	خوشی محمد خاں ناظر	۳۳
۸۔ چاندی کی وادی (افسانہ)	سید شبیر حسین	۳۵
۹۔ غزل	فیض احمد فیض	۵۷
۱۰۔ بازگشت (ایک انگریزی نظم کا فارسی ترجمہ)	پروفیسر محمود خاں شیرانی	۵۸
۱۱۔ بنجیا (افسانہ)	اپندر ناتھ اشک	۵۹
۱۲۔ غزل	خواجہ فیروز الدین احمد	۶۳
۱۳۔ سال نو کا تحفہ (نظم)	کنیز فاطمہ حیا لکھنوی	۶۴
۱۴۔ رابرٹ اسکاٹ قطب جنوبی کی تلاش میں۔	ممتاز حسین	۶۵
۱۵۔ ایک رہگزر پر (نظم)	فیض احمد فیض	۷۶
۱۶۔ جبریل کا پیغام ہندستان کے فرزندوں کے نام (نظم)	ناز سیالکوٹی	۷۷
۱۷۔ بے گناہ (افسانہ)	احمد ندیم قاسمی	۷۸
۱۸۔ بازدید (نظم)	بشیر حسین ضیائی	۸۷
۱۹۔ عبدالعزیز ابن سعود (سوانح)	کے۔ اے۔ حمید	۸۹
۲۰۔ تلاش (نظم)	ایس۔ اے۔ رحمٰن	۹۳
۲۱۔ خیال کا جال (افسانہ)	م۔ عمر۔ فاروق	۹۵
۲۲۔ شباب رفتہ (نظم)	خانصاحب شیخ عالم علی	۹۹
۲۳۔ نہایت دیانت داری سے (حکایت)	چودھری فضل حق تصیر	۱۰۱
۲۴۔ غزل۔	حمید عرفانی	۱۰۶
۲۵۔ میراراز (نظم)	اختر شیرانی	۱۰۷
۲۶۔ حقائق (افسانہ)	خادم حسین خادم بٹالوی	۱۰۸
۲۷۔ لاہور امروز (غزل)	نصراللہ خاں عزیز	۱۱۵
۲۸۔ آئینہ حیرت (غزل)	عبدالحمید حیرت شملوی	۱۱۶
۲۹۔ شرابی کی قبر (افسانہ)	محمود عبدالحی مجی	۱۱۷
۳۰۔ نبات شیراز (فارسی غزل)	مرتضیٰ احمد خاں میکش	۱۳۰
۳۱۔ میں پریشان رہتا ہوں۔	"عندلیب اودھ"	۱۳۱
۳۲۔ غزل	ایم ضیاء الاسلام	۱۳۲
۳۳۔ لیڈر اور ایڈیٹر کا مناظرہ (مزاحیہ نظم)	جعفر نیمی	۱۳۳
۳۴۔ اشتہارات		۱۳۶

اختر شیرانی کے رسائل بہارستان، انتخاب، خیالستان، رومان، سہیلی اور شاہکار وغیرہ کو زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔ کوشش و تلاش سے ان رسالوں کی فائلیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اپنے باپ علامہ شیرانی کی طرح اختر کی طبیعت بھی خالص تحقیقی اور علمی مسائل کی طرف مائل تھی۔ وہ ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے بھی بہت وقیع درجہ رکھتے ہیں مگر ان کے نثری کارنامے پردۂ خفا میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مداحین بھی اس بات سے واقف نہیں کہ وہ ایک اچھے نثر نگار اور لائق صحافی بھی تھے۔ یونس حسنی نے "نخلستان" اودے پور کے پہلے شمارے میں ان کی نثری تصانیف پر کچھ روشنی ڈالی تھی مگر ان کا مضمون اتنی روا روی میں لکھا گیا ہے کہ تشنگی اور بے مائگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ تحقیقی شغف سے متصف حضرات اس طرف توجہ دیں اور ان کے ناولوں، ترجموں و دیگر نثری کتابوں کا بسیط جائزہ لے کر اردو نثر کی تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کریں۔

———

مناظر عاشق ہرگانوی

دہ مجلس کا اردو ترجمہ؟

("ہماری زبان" کے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں "فضلی کی کربل کتھا یا دہ مجلس شائع ہوگئی" کا اعلان نظر سے گزرا۔)

"دہ مجلس" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں ۱۲۲۳ھ میں محمد رحمت اللہ نام، قوم انصاری، متخلص "قیدی" نے کیا تھا اور اس کا تاریخی نام "ترجمہ مجلس ماتم کا" رکھا تھا۔ پھر اسی ترجمہ کو سید علی حافظ نے ۱۲۲۸ھ میں نقل کیا تھا اور ۱۲۳۶ھ میں موضع نگرسن تحصیل ہنڈیہ، ضلع الٰہ آباد کے میر باقر علی کے امام باڑے میں نذر کیا تھا۔ سرِ کتاب پر یہ عبارت تھی "بتاریخ عشرہ محرم الحرام سنہ ۱۲۳۶ ہجری قدسی این کتاب سیبت انتساب را سرگشتہ وادی عصیان احقر الناس علی حافظ برائے داخل شدن ثواب جملۂ مومنین در امام باڑہ سیدی سندی میر باقر علی صاحب نذر نمود۔"

محمد رحمت اللہ نے کتاب کی وجہ تالیف یہ لکھی ہے۔

"اکثر مومنین محرم کی چاند رات سے تعزیہ داری کی مجلس میں کتاب سننے کو اس غریب بیکس کے یہاں آتے تھے (محمد رحمت اللہ نے اپنی سکونت اور پتہ یوں لکھا ہے "ساکن شہر بیکسی مقیم محلہ تنہائی" شاید اس کی وجہ ناداری اور انکساری ہو اور نام و نمود کا انھیں کوئی شوق نہ ہو؟ م۔ ع۔ ہ) لیکن کیفیت یوں ہے کہ ان میں جو عورت اشخاص (؟) یا اہل علم تھے ان کو تو احوال کتاب غم کا ظاہر ہی تھا مگر بعض عوام الناس کہ بے علم محض تھے ان کے تئیں تو تردد خاطر ہی تھا۔ اگرچہ پڑھنے والا عبارت کے ساتھ مکرر معنی بھی کہتا تھا لیکن پھر بھی بسبب فارسیت کے مضمون مدعا کا سمجھنے سے رہتا تھا تو اسی واسطے اس ہیچمدان نے ترجمہ دہ مجلس کا عبارت نثر میں بیچ ریختہ زبان کے لکھا۔"

ترجمہ میں نہ تو آورد ہے، نہ تصنع، نہ پرشکوہ الفاظ ہیں، نہ سجی ہوئی تشبیہیں، نہ خلاف فطرت عناصر کی چاشنی ہے، نہ رومانیت کا غلبہ۔ سیدھی سادی بات ہے مگر اس کا اثر اور غضب کی سادگی ہے۔ (۱۲۲۳ھ کی زبان کو دیکھتے ہوئے) ساری کتاب یہ ترجمہ ایک سو ستر (۱۷۰) صفحات کی ہے۔ ہر صفحے میں ۱۳ سطریں ہیں۔ پندرہ سولہ الفاظ فی سطر کا اوسط ہے۔ ہر باب سے ایک نئی شہادت شروع ہوتی ہے۔ ۱۷۰ صفحہ تک دس شہادتیں یا مجلسیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد "شہداء حالات بعد شہادت حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام" ہے۔[1]

لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے جولائی ۱۹۳۷ء کے شمارہ میں صفحہ ۳۰۷ پر درج ہے کہ "میر فضل نے سنہ ۱۱۴۵ھ مطابق سنہ ۱۷۳۲ء میں "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ فارسی سے اردو نثر میں کیا اور اس کا نام "دہ مجلس" رکھا۔ اس کتاب میں "ائمہ معصومین کی شان میں کچھ نظمیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں"[2]

لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ فضلی نے "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا اور اس کا نام "دہ مجلس" رکھا۔ پھر محمد رحمت اللہ نے "دہ مجلس" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کر کے اس کا نام "ترجمہ مجلس ماتم کا" رکھا؟

پھر فضلی کی کربل کتھا یا دہ مجلس شائع ہوگئی، کے اشتہارات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کتاب فارسی میں شائع ہوئی ہے یا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے؟

[1] سہ ماہی "اردو" اورنگ آباد (دکن)، اپریل ۱۹۳۴ء حصہ ۲، ص ۲۵۵۔

[2] تاریخ ادب اردو، حصہ نثر ص ۳۔

قطعاتِ عید

واحد پریمی

عداوتوں کو مٹاؤ کہ عید کا دن ہے
وفا کا ہاتھ بڑھاؤ کہ عید کا دن ہے
جنھیں سمجھتے رہے ہو تم آج تک دشمن
گلے انھیں بھی لگاؤ کہ عید کا دن ہے

یہ سچ ہے عید پیامِ نشاط لاتی ہے
امیر کے لیے لیکن سعید ہوتی ہے
شکستہ دل، نظر افسردہ، حال آشفتہ
کسی غریب کی اس طرح عید ہوتی ہے

جو بات روز کی ہے اس کو چھوڑیے لیکن
نظر اداس ہے رخ زرد عید کے دن بھی
عجب نظام ہے مصروفِ عیش کوئی ہے
کوئی ہے وقفِ غم و درد عید کے دن بھی

غزلیں

حسن کمال

نقش بھی اس کے یاد نہیں ہیں نام بھی کچھ کچھ بھول چلا ہے
جانے ہر چہرے پر ہم کو کس کا چہرہ یاد آتا ہے
پہلے بھی گہنایا ہوا تھا، دھندلا نور لٹاتا تھا
اب اتنا ہے نام کا وہ اندھا سورج بھی ڈوب چکا ہے
یہ تو نہیں سب ہی سوتے ہوں، جیسے یقیں سب لوٹ کے جا
کوئی تیری اس نگری میں جانے کب سے جاگ رہا ہے
پہلے تصورِ ہجر کا ہم کو، کتنی لذت دیتا تھا
ہجر میں سچ مچ کیا ہوتا ہے اب جا کر احساس ہوا ہے
آوازوں کا راج ہے اس میں شور کا سکہ چلتا ہے
فکروں نے کچھ سوچ سمجھ کر خود چپ کا بن باس لیا ہے
ہنگاموں سے بھری پڑی سڑکوں کو شاید علم نہیں
سونی سونی راہگزاروں کے اوپر کیا ظلم ہوا ہے
یہی حسن اب سرمایہ ہے خونِ جگر بھی دے کے بچاؤ
ایسی طوفانی راتوں میں جو آگ آدھا دیا جلتا ہے

نوری ٹونکی

نظر قاتل بھی ہے تسکینِ جاں بھی
خزاں بھی ہے بہارِ بے خزاں بھی
کیے جا سجدہ ہائے شوقِ پیہم
کبھی تو سجدے ہوں گے کامراں بھی
جو گل زیبِ ردائے گلستاں ہے
وہی گل ہے حریفِ گلستاں بھی
نوری جو غم حریفِ زندگی ہے
وہی غم ہے حیاتِ جاوداں بھی

سوویت یونین میں اردو ادب کی مقبولیت

یرموشکن

سوویت یونین میں اردو ادب کو کافی مقبولیت حاصل ہے۔ اگر ہم اردو کے ان شاعروں اور ادیبوں کی فہرست پر نظر ڈالیں جن کی تصانیف سوویت یونین میں شائع ہو چکی ہیں تو ہمیں ان تمام شاعروں اور ادیبوں کے نام نظر آئیں گے، جو اردو ادب میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً میر امن کی تحریریں جنھیں اردو نثر کی داغ بیل ڈالنے والے ادیبوں میں گنا جاتا ہے سوویت یونین میں چار مختلف جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی سب سے بہتر کتاب "باغ و بہار" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں غالب کی غزلوں کا پہلا روسی ترجمہ شائع ہوا تھا اور اس وقت سے لیکر آج تک ان کی دلکش غزلیں مشرقی شعراء کے ان مجموعوں میں برابر جگہ پاتی رہی ہیں جو مستقل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں تک پریم چند اور کرشن چندر جیسے ادیبوں کا سوال ہے، انھیں سوویت عوام میں اتنی ہی مقبولیت حاصل ہے جتنی مغربی یورپ کے کلاسکی ادیبوں کو۔ اس سلسلے میں چند اعداد و شمار حاضرِ خدمت ہیں۔ پریم چند کے بہترین ناول "گئودان" کی اردو سے ترجمہ ہو کر روسی زبان میں نو لاکھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کرشن چندر کی تخلیقات کا ترجمہ سوویت عوام کی ۱۴ زبانوں میں ہوا ہے اور ان کی پندرہ لاکھ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

اردو ادب سے سوویت یونین میں دلچسپی صرف ترجموں تک محدود نہیں۔ ہندوستانی ادب کے سوویت ماہروں کا ایک بڑا گروہ اس کے مختلف رجحانات پر وسیع تحقیقی کام کر رہا ہے۔ وہ سوویت قارئین کے وسیع حلقوں کو ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں سے روشناس کرانے کا کام انجام دے رہا ہے اور دلچسپ مقالے شائع کر رہا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں ہی اس سلسلے کی تین بہترین تصنیفات شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلا مقالہ مشرقی اقوام کے ادارے کے ایک رکن سخا چیف کا ہے جنھوں نے اردو ناول میں حقیقت نگاری کی نشو و نما کے ابتدائی مراحل کا جائزہ لیا ہے۔ مقالہ میں میر امن، رجب علی بیگ سرور، نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبد الحلیم شرر اور محمد ہادی رسوا کی تحریروں کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ تیسرا مقالہ ہندوستانی ادب کی ماہر پریگارینا کا ہے جنھوں نے اقبال کی ابتدائی رومانی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرا مقالہ کرشن چندر کی تخلیقات سے متعلق ہے

(بشکریہ سوویت دیس)

——x——

مراسلات

سالہا سال*

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ایک تقریر میں یہ جملہ کہا تھا:

"میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہا سال سے ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا ہے۔"

ادارۂ ماہنامہ "تحریک" دہلی نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ:

"یہاں سالہا سال کا استعمال محل نظر ہے بشرطیکہ مولانا آزاد آداگون پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔"

نومبر ۶۵ء کے "تحریک" میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی نے ادارے کے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ:

"میری رائے یہ ہے کہ یہاں سالہا سال کا مفہوم سمجھنے میں حاشیہ نگار سے سہو ہوا ہے۔ سالہا فارسی میں سال کی جمع ہے اور سالہا سال سے ان کے معنی بہت برسوں سے ہیں۔ حاشیہ نگار نے شاید سالہا سال کے معنی صدہا سمجھ لیے ہیں اور اس طور پر آداگون کا مسئلہ چھیڑ دیا ہے جو بالکل غیر متعلق ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر پر تحریک کے حاشیہ نگار نے پھر یہ حاشیہ لکھا ہے کہ:

"سالہا سال کے مفہوم کے بارے میں مغالطہ حاشیہ نگار کو نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد اور جناب خلیل الرحمٰن اعظمی کو ہوا ہے۔ سالہا سال ہمیشہ ان گنت برسوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔"

یہ بحث مجھے دلچسپ معلوم ہوئی۔ "سالہا سال" کی تحقیق کے سلسلے میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے ارباب نظر کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ "سالہا سال" اور "ان گنت" کا محل استعمال جدا جدا ہے۔

"سالہا سال" کے سلسلے میں میں نے فارسی کی کچھ پرانی لغات دیکھیں مجھے ان میں کہیں "سالہا سال" نہیں ملا۔ اور لغتوں کا کہہ نہیں سکتا۔ جن لغتوں تک میری رسائی ہوئی ہے ان کا حاصل مطالعہ اس سلسلے میں یہ ہے:

فرہنگ آنندراج:-

"سالیان، بمعنی سالہا، نیز در پارسی آمدہ و صحیح است کہ جمع سال باشد و بمعنی سفر و نیز آمدہ بر قیاس ماہیان۔" استاد فرخی سے

زمروی انچہ تو کردی بگاہ اندک سال
بہ سالیان فراوان نکردرستم زر (؟)

خواجہ نظامی سے

چناں زی کز اں زیستن سالہا
ترا سود و کس را نباشد زیاں

(ج ۲ ص ۹۵۸ مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۲ء)

فرہنگ رشیدی: (ملا عبدالرشید تتوی)

"سالیان، بمعنی سالہا ...... بمعنی سال واحد نیز آمدہ"

بہار عجم:

"سالیان، جمع سال و بمعنی سفر و نیز آمدہ بر قیاس ماہیان۔"

استاد فرخی سے:

زمروی انچہ تو کردی الخ

خواجہ نظامی سے

چناں زی کز اں زیستن ...... الخ

(ج ۲ ص ۷۶ مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۵ء)

غیاث اللغات:

"سالیان، جمع سال خلاف قیاس و بمعنی سال واحد نیز دریں صورت الف و نون زائد باشد چناں کہ در بہاراں ......

..... در سراج چنیں نوشتہ کہ سالیان جمع سالی یعنی چیزی کہ سال ازاں قرار گرفتہ باشد و آں وقت و زمانہ است۔ پس سالیان بمعنی ازمنہ و اوقات باشد۔"

(پانچواں ایڈیشن مطبوعہ نولکشور ص ۲۱۵)

ان چار فارسی لغتوں میں تو کہیں بھی "سالہا سال" نہیں ملا۔ لیکن سلیمان حئیم کی "فرہنگ بزرگ فارسی۔ انگلیسی" (مطبوعہ ۱۹۵۲ء) میں یہ دیکھا ہے:

"سالہا (ی) سال، for many years"

اردو لغتوں میں "فیروز اللغات جدید" (طبع چہارم ۱۹۴۱ء) کے صفحہ ۵۹۷ پر "سالہا سال" کو فارسی لفظ قرار دے کر اس کے معنی "برسوں" لکھے ہیں۔

"فرہنگ آصفیہ" نے بھی اسے فارسی قرار دیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:

"سالہا سال: (ف) تابع فعل، برسوں، مدتوں، قرنوں۔" (طبع اول ج ۳ ص ۱۱)

غالباً یہ ہندوستان کے فارسی دانوں یا اردو والوں کا مخصوص محاورہ ہوگا جسے بعد میں ایران نے بھی قبول کر لیا ہوگا۔ "سالہا" کے بعد "سال" کثرت کے اظہار کے لیے بڑھایا گیا ہے۔ اس کے آگے حرف ربط "سے" کی وجہ سے تسلسل کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو اور قوی بنانا چاہیں تو "برابر" کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً "سالہا سال سے برابر یہ کہتے آئے ہیں۔"

---

* دسمبر ۶۵ء کے "تحریک" میں ڈاکٹر اعظمی نے "سالہا سال" کے محل استعمال کی مثالیں اردو کے مستند ادیبوں کے یہاں سے دی ہیں۔

سالہا سال طویل مدت کے لیے مستعمل ہے۔ اسی طرح قرن بھی ہے۔ قرن کے متعلق بہار عجم کہتی ہے،

"قرن، بالفتح، روزگار و زمانہ و مدت سی سال یا ہشتاد سال یا صد و بست سال و این اصح است کذا فی المنتخب۔

اوحدالدین انوری سے

دو قرن از کرمت برده جهان برگ و نوا
تو چه دانی که جهان بے تو چه بے برگ و نواست

(ج ۲ ص ۶۰ ، نولکشور ۱۹۱۵ء)

فرہنگ آنند راج بھی یہی کہتی ہے۔ غیاث اللغات میں لکھا ہے۔

"قرن .... مدت طویل و در تعیین آں اختلاف است صاحب قاموس نوشتہ کہ صد سال و در منتخب سی سال یا ہشتاد سال یا صد سال و در بہار ہشتاد سال و بعضی گویند کہ سی سال است و در صراح و کشف و غیرہ سی سال و فی زماننا ہمیں مختار است۔"

فرہنگ آصفیہ میں قرن کے معنی ہیں۔

"جگ، دس، بارہ، تیس، اسی، یا ایک سو بیس برس کا زمانہ۔ بعض لوگوں نے صدی کو بھی لکھا ہے لیکن عموماً بارہ برس کے عرصے کو کہتے ہیں۔"

(ج ۳ ص ۲۸۲)

فارسی جدید میں قرن صدی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً قرن چہاردہم یعنی چودھویں صدی ہجری۔ "ان گنت" سے ایک مبہم کثیر تعداد مراد ہوتی ہے،

"ان گنت، صدہا، بے شمار، بے حساب، بے حد"

(فرہنگ آصفیہ ص ۲۰۷)

یہ لغوی تشریح خاص طور پر قرن کی، اس لیے ضروری ہے کہ مبہم طول زمانہ و تعداد کی تعیین کے لیے موضوع بحث کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے نہ مدت معین کی جا سکتی ہے نہ تعداد۔ "قرن" کے مفہوم میں تعیین مدت کا اختلاف سیاق و سباق کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح سالہا سال کی بھی کوئی مطلق تعیین مدت نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی، اسی طرح ایک مبہم طویل مدت ہے۔ طبقات الارض کی ساخت کا ذکر ہو تو "سالہا سال" کہنا بہ طریق تنزل ہوگا۔ کاروبار عشق میں بہ طریق مبالغہ آن واحد کو بھی جاوداں اور روز قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً سے

حساب عمر صد عاقل بحشر بگذرد یک دم
حساب یک دم عاشق بصد محشر نمی گنجد

یا سے
ایک نظر نگاہ، سو برس جاوداں
عشق کا آغاز ہی عشق کا انجام ہے

انسانی زندگی میں ایک مبہم طویل مدت مثلاً چالیس پچاس برس کے لیے "سالہا سال" کہنا بالکل درست ہوگا کسی جنم یا "آواگون" ماننے کی ضرورت نہیں۔ "سالہا سال" وہاں بھی استعمال کر سکتے ہیں جہاں انگریزی میں year after year بولا جاتا ہے۔ یہی حال "ان گنت" کا ہے۔ مثلاً "شیخ حسن بھشتی نے اپنی بیٹی کی شادی میں ان گنت روپیہ خرچ کیا۔" یہاں شیخ حسن بھشتی کی ماہانہ آمدنی کا لحاظ کر کے چار سو یا پانسو روپے ہی ان گنت ہوں گے۔ ہندستان کی قرض داری کا ذکر ہو تو ارب کھرب سے آگے بھی کچھ اور ان گنت کا مفہوم ہو سکتا ہے۔

غرض "سالہا سال" سے ایک مبہم طویل مدت اور "ان گنت" سے ایک مبہم کثیر تعداد مراد ہوتے ہیں۔ موضوع گفتگو کو پیش نظر رکھ کر اس کے تعیین کا قیاس کرنا چاہیے۔

(ذکا صدیقی رامپور)

کچھ کربل کتھا کے بارے میں

۱۵ دسمبر کے "ہماری زبان" میں عنوان بالا کے تحت میں نے ایک بنیادی سوال اٹھایا تھا کہ کیا مولوی کریم الدین نے کربل کتھا کے اسی نسخے کا اقتباس پیش کیا تھا جو آج مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس باب میں مرتبین کا یہ موقف ہے کہ دونوں نسخے ایک ہی ہیں لیکن میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ نسخۂ کریم الدین نسخۂ اشپرنگر سے مختلف تھا۔ اس کے ثبوت میں میں نے دونوں نسخوں سے چند جملے نقل کیے تھے اور اختلاف متن کی نشاندہی کی تھی۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی ثبوت نہیں۔ اس سے بڑے ثبوت کی اور کیا ضرورت ہے کہ کریم الدین کے پاس جو نسخہ تھا، اس میں "بارہ مجلس اور ایک خاتمہ" (طبقات ص ۱۰۶) تھا جب کہ مطبوعہ نسخے میں "ایک مقدمہ اور بارہ (بارہ) مجلس اور ایک خاتمہ" [کربل کتھا ص ۴] کا ذکر ہے۔ دوسرے الفاظ میں کریم الدین کے نسخے سے "مقدمہ" غیر حاضر تھا جس سے یہ شک بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ نسخۂ اشپرنگر میں جو مقدمہ ہے وہ الحاقی ہے۔

اسی عنوان کے تحت یکم جنوری کے "ہماری زبان" میں جناب ڈاکٹر مختارالدین احمد نے اپنے موقف کی توثیق کرتے ہوئے کہا کہ کریم الدین نے غیر ضروری نثر کے حصے حذف کر دیے ہیں اور نثر کی عبارت سے شعر نکال دیے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اغلاط و تصرفات کی ایک اچھی خاصی فہرست پیش کی ہے لیکن نہ تو یہ فہرست اصل سوال کو حل کر سکی اور نہ ان کی پیش کردہ تاویل مرتبین کا یہ قول محتاج ثبوت ہے کہ کریم الدین نے غیر ضروری نثر کے حصے حذف کر دیے ہیں۔

جہاں تک اغلاط و تصرفات کا سوال ہے، ان کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اغلاط و تصرفات کا تعیین ہمیشہ اور ہر حال میں قوی تر دلائل کی روشنی میں

کیا جاتا ہے۔ یہ جو فاضل مضمون نگار نے محمد حسین آزاد سے لے کر حامد حسن قادری تک کے تصرفات کا ذکر کیا ہے، ان کا علم انھیں اسی وقت تو ہوا جب انھوں نے طبقاتِ شعرائے ہند کا مطالعہ کیا۔ اسی طرح صاحبِ طبقات کی طرف جو تصرفات منسوب کیے جا رہے ہیں، ان کا بھی تو کوئی ماخذ ہوگا۔ مرتبین کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ صاحبِ طبقات نے غیر ضروری نثر کے حصے حذف کر دیے ہیں۔

میں متن سے استدلال کر رہا ہوں، مرتبین قیاس سے کام لے رہے ہیں۔ میں اس شخص کا قول نقل کر رہا ہوں جس کی زبان سے دنیا نے پہلی بار کربل کتھا کا نام سنا، مرتبین کی معلومات کا ماخذ و منبع ایک ایسا نسخہ ہے جس کے بارے میں وہ خود یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس کی کتابت طبقاتِ شعرائے ہند کی اشاعت سے پہلے ہوئی یا اس کے بعد۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنا موقف واضح کر دیا ہے۔ اس موضوع پر میری یہ آخری تحریر ہے اور اب مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

(ڈاکٹر محمود الٰہی)

کچھ ہنگی کتابوں کے کم خرچ سلسلے کے بارے میں

ذکا صدیقی صاحب نے اپنے مضمون "ہنگی کتابوں کا کم خرچ سلسلہ" (ہماری زبان ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء) میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "سرشار کے خوجی کے بعد چچا چھکن وہ دوسرا زندہ جاوید کردار ہے جس کی نقش گری کا سہرا اردو کے مشہور ادیب امتیاز علی تاج کے سر ہے" تاج صاحب نے یا تو یہ سہرا زبردستی اپنے سر باندھ لیا ہے یا زبردستی ان کے سر باندھ دیا گیا ہے کیونکہ چچا چھکن کا زندہ جاوید کردار ان کی اپنی تخلیق ہرگز نہیں ہے۔ اس کردار کا خالق انگریزی ادب کا مشہور مزاح نگار جیروم۔ کے۔ جیروم (JEROME K JEROME) ہے۔ چچا چھکن "انکل پاجر" UNCLE PODGER کا اردو چربہ ہے۔ "چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" اور دوسرے مضامین جیروم کے UNCLE PODGER PUTS THE PICTURE وغیرہ سے مکمل طور پر ماخوذ ہیں اور ادبی سرقہ کی ایک اچھی مثال ہیں سرشار کا خوجی پا آزاد طبع زاد اور خالص ہندوستانی ہے مگر یہ بات چچا چھکن کے لیے نہیں کہی جا سکتی۔

"شیر کیا سوچتا ہوگا" کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ کتاب آج سے تقریباً بائیس تیئس سال پہلے "آئینہ حیرت" کے نام سے ساقی بکڈپو نے شایع کی تھی۔ رفیق حسین صاحب کے یہ مضامین بھی پہلے رسالہ ساقی میں جب وہ دہلی سے شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں نکلتا تھا شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجموعے کے بعد رفیق صاحب نے جو غالباً خود بھی جنگلات سے منسلک تھے لکھنا ترک کر دیا کیونکہ پھر ان کے مضامین کسی رسالے میں نظر نہیں آئے۔ اب وہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں ہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ بہر کیف یہ مضامین اردو میں اپنی نوعیت کے بہترین مضامین میں سے ہیں اور شاید مشہور انگریز شکاری جم کاربٹ Jim Corbett کی تخلیقات سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔

(عباس ازل)

اردو دوستوں سے اپیل

سرائے امانت خاں ضلع امرتسر سرحد پاک کے عین قریب واقع ہے اور اس مقام پر اردو کالج اور لائبریری کا قائم ہونا خالی از تعجب نہیں۔ پنجاب میں اردو بدستور قائم ہے گرچہ نئی پود ہندی پنجابی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے مگر طالبانِ اردو کو مفت اردو پڑھانے کی کوشش جاری ہے۔ اخبارات کے مدیران کو چاہیے کہ وہ اخبارات اور دیگر اشاعتیں برائے افادۂ عام اردو کالج کو ضرور بھجوا دیا کریں۔ کالج میں طلبا کی تعداد چھ سات تک ہے امید ہے کہ یہ تعداد بڑھنے لگے گی۔

(پرنسپل اردو کالج و لائبریری پوسٹ آفس سرائے امانت خاں امرتسر)

سہیل اکیڈمی کا قیام

اردو کے مشہور شاعر جناب اقبال سہیل کی یاد میں جونپور میں سہیل اکیڈمی قائم کی گئی ہے اس اکیڈمی کے حسبِ ذیل مقاصد ہیں۔

اقبال سہیل کے تنقیدی مضامین اور اُن کی شاعرانہ تخلیقات کا جائزہ لیا جائے اور انھیں سلیقہ سے ترتیب دے کر منظرِ عام پر لایا جائے۔

اپنی فطری بے نیازی کی بنا پر سہیل نے اپنے زادہ طبع کو کبھی طبع نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام کا ایک حصہ ضائع ہو گیا، اور جو بچ رہا ہے اُس کے بہت سے اجزا دوستوں اور عقیدت مندوں میں منتشر ہو گئے۔

"سہیل اکیڈمی" ان منتشر غیر مطبوعہ اجزا کو بھی مدون کر کے منظرِ عام پر لائے گی۔

چونکہ سہیل نے ہر صنفِ سخن کو صالح صحت مند اور حیات آفریں فکر کے ساتھ ساتھ تخیل اور اسلوب کی ایک نئی آب و تاب عطا کی ہے، اس لیے "سہیل اکیڈمی" صنفِ سخن کے اعتبار سے ان کے کلام پر الگ الگ تنقیدی کتابیں بھی شائع کرے گی۔

سہیل کے کلام کو دیوناگری رسم الخط میں بھی منتقل کرے گی۔

باقاعدگی کے ساتھ ہر سال "یومِ سہیل" منائے گی، جس میں علمی و ادبی مجلس مذاکرہ (سمپوزیم) کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سطح پر محفلِ سخن بھی آراستہ ہوگی۔

"سہیل اکیڈمی" کا ابتدائی نصب العین وہی ہے جسے اوپر پیش کیا گیا، لیکن اس نصب العین کے ساتھ ساتھ اس کے چند اور مقاصد ہیں جو علی الترتیب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

جدید و قدیم ادبا و شعرا میں سے اُن اربابِ فکر و فن سے ملک کو روشناس کرائے گی جن کی عظمت مختلف وجوہ کی بنا پر دب سی گئی ہے۔

اُن تخلیقات کو منظرِ عام پر لائے گی جو حیات آفریں جمالیاتی قدروں کا پرتو ہوں، اور انسانی وجدان کو مسرور و کیف عطا کر سکیں۔

ہر اُس فن پارے کو شائع کرے گی جو قومی ہم آہنگی، سیاسی و معاشی مساوات، انسانی وحدت، انسانی شرف، انسانی آزادی، انسانی امن و مسرت، اور انسانی عروج و ارتقا کا واضح تصور رکھتا ہو۔

ہر اس تحریک کی مخالفت کرے گی جو جاگیرداری، سرمایہ داری، طبقہ واریت، آمریت، اور فرقہ وارانہ کشاکش کی حامی ہو۔

اُس ادبی تحریک کو بھی ہدفِ تنقید بنائے گی جس کی بنا پر شعر و فن کی نزہت گاہ جمال میں فحاشی، جنسی انارکی، مجہولیت، سماجی تاراج، یاسیت اور لذت پرستی جیسے تخریبی عناصر راہ پا سکیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے فنکاروں کی اچھی تخلیقات کا انتخاب مع تعارف کے گاہے گاہے شائع کرے گی۔

ادبی و تہذیبی ورثہ کی قدر و قیمت کا از سرِ نو تجزیہ (REVALUATION) کرے گی۔

چونکہ افریقہ اور ایشیا کے نو آزاد ممالک کے بیشتر مسائل ایک سے ہیں، اس اعتبار سے ہر جگہ کی جدید ادبی اقدار بھی تقریباً ایک سی ہیں، تو افق کی بنا پر افرو ایشیائی ادیبوں سے رابطہ رکھے گی۔

قومی یکجہتی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ہندوستان کے ہر خطے اور ہر فرقے کا بجا طور پر احترام کریں اور لسانی منافرت اور تشدد اگر کسی گوشہ سے بھی ابھر رہا ہو تو اسے دبانے کی کوشش کریں۔ "سہیل اکیڈمی" اس وسیع تصور کے تحت ہندوستان میں لسانی توافق کو اپنا مقصد جانے گی اور اس سلسلہ میں لسانی تصادم کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔

اردو ہندوستان کی تہذیبی زنگارنگی کا پرتو ہے۔ "سہیل اکیڈمی" اس کی ترویج و اشاعت اور اس کے عروج و ارتقا میں بھرپور حصہ لے گی۔

علم و ادب کے ہر شعبہ میں تخلیقی یا اختراعی فکر (ORIGINAL THINKING) کی خاص طور سے ہمت افزائی کرے گی۔

چونکہ سہیل نے دبستانِ شبلی کے گہوارۂ علم و فن میں تربیت پائی تھی، اس نسبت سے "سہیل اکیڈمی" حلقۂ شبلی کے اکابر مثلاً ابوالکلام آزاد وغیرہ پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات کتابی صورت میں شائع کرے گی۔

"سہیل اکیڈمی" کے لیے جلد ایک عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے گی جس میں اردو کے کچھ محقق ادیب شاعر بغرض مطالعہ تصنیف و تالیف کا کام کریں گے۔ اکیڈمی ایک کتب خانہ بھی قائم کرے گی۔

"سہیل اکیڈمی" اپنا ایک علمی و ادبی ترجمان ماہنامہ کی شکل میں نکالے گی جو اس کے تصورات اور ہمہ گیر ادبی نظریات کو قوت و تاثیر کے ساتھ ملک میں پھیلائے گا۔

"سہیل اکیڈمی" باقاعدگی کے ساتھ ہفتہ وار یا ماہانہ ادبی نشست منعقد کرے گی جس میں ادیب شاعر اپنی تخلیقات پیش کریں گے۔ اکیڈمی ان تخلیقات کو محفوظ رکھے گی اور ان کا انتخاب شائع کر کے منظرِ عام پر لائے گی۔

افتخار اعظمی

(سہیل اکیڈمی مرکزی دفتر - بلوا گھاٹ جونپور)

اردو تعلیم کی ترقی و توسیع کے لیے حکومت کی مراعات

حیدر آباد ۲۰ جنوری حکومت آندھرا پردیش نے یقین دلایا ہے کہ ریاستی معاملات میں علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے مرحلے میں اردو کو بھی مستحق مقام دینے کا سوال اور مطالبہ کا خاص لحاظ رکھا جائے گا جناب ابن بھگوان نے اس آئی ساے انجمن معتمد تعلیم نے حکومت کے اس نقطہ نظر سے ایک مکتوب کے ذریعہ واقف کرایا ہے۔ جناب ایم بارگا ریڈی ایم۔ ایل۔ اے نے آج اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے ریاست میں اردو تعلیم کی ترقی و توسیع سے متعلق حکومت کی جانب سے بعض نئی سہولتوں اور مراعات کی تفصیلات سے واقف کرایا۔ حکومت آندھرا پردیش نے اس مطالبہ کو قبول کر لیا ہے کہ ایک بار کسی اردو جماعت کے قیام اور اس سلسلے میں طلبہ کی ضروری تعداد کے حصول کے بعد آئندہ اعلیٰ جماعتیں خود بخود قائم کر دی جائیں گی حکومت نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ نظامت تعلیمات میں ایک اردو جاننے والے نائب ناظم کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے اردو ذریعہ تعلیم کے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات بھی سائنس اور اردو ٹرینڈ گریجوٹیس کی کمی و قلت کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے آندھرا پردیش پبلک سروس کمیشن سے ٹرینڈ سائنس گریجوٹیس کی بھرتی کا انتظام کرنے کی خواہش بھی کی ہے۔

اجین گرلس ڈگری کالج کی بزم ادب کا افتتاح

اجین اردو ہندی کا تنازعہ چند خود غرض سیاسی مفاد پرستوں کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ اردو کا ہندی سے کوئی بیر نہیں۔ لیکن ہر پھول کو کھلنے دو کے اصول پر کاربند رہ کر وہ اپنے زندہ رہنے اور پھولنے پھلنے کا حق چاہتی ہے اور اس کا یہ حق کوئی چھین نہیں سکتا۔"

یہ الفاظ حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبہ اردو کے قائم مقام صدر پروفیسر آفاق احمد نے مقامی گرلس ڈگری کالج کی بزم ادب کا افتتاح کرتے ہوئے کہے۔

شروع میں گرلس ڈگری کالج کی بزم ادب کی نگران پروفیسر مس انیس سلطان نے مہمان کا تعارف اور ان سے بزم کا افتتاح کرنے کی درخواست کی۔

جلسہ میں بڑی تعداد میں اساتذہ، ممبرز اور طالبات نے شرکت کی۔ بعد میں ایک پر تکلف پارٹی بھی ہوئی۔

(محی الدین ناگوری)

گوالیار میں نئی نظم پر مذاکرہ

گوالیار۔ ۳۰ دسمبر۔

انجمن ترقی اردو گوالیار کی جانب سے مقامی تعلیمی و تہذیبی ادارہ "گیان اودے" کی عمارت میں بمبئی سے آئے ہوئے نوجوان شاعر ندا فاضلی کے اعزاز میں ایک خاص نشست کا انعقاد کیا گیا۔ نئی نظم پر تقریر کرتے ہوئے ندا فاضلی نے کہا کہ اردو کی نئی نظم اپنے روپ، موضوع اور زبان کے لحاظ سے اپنے سے پہلے کے دور کی نظم سے بالکل مختلف ہے، اور یہ اختلاف کا شعور ہی نئے عہد کے نئے حالات میں نئی اقدار کی کھوج کا ثبوت ہے۔

نشست کی صدارت نئی پیڑھی کے مشہور ہندی کہانی کار جناب شانی نے کی۔ شانی صاحب نے اپنی صدارتی جملوں میں ہندوستانی ادب میں جدید رجحانات کے تاریخی امکانات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا ہمیں اپنے ادب کو عالمی اقدار کی روشنی میں جانچنے پرکھنے کی ضرورت ہے ہندی میں پہلی بار سچے انسان کو زبان ملی ہے اور میرے خیال میں اردو میں بھی آزادی کے بعد ہی سے نئی نظم کی بھرپور اٹھان پائی جاتی ہے۔

وفا صدیقی، گلشن تلوانی، رام پرکاش تریاٹھی، گووند اشے، نو ودت، نشار پردیز اور رام بلاس شرما نے بحث میں حصہ لیا۔

اسلام الدین قریشی
سکریٹری انجمن ترقی اردو گوالیار

تبصرے

رگ جاں　خورشید الاسلام

قیمت: ۲۱ روپے، ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ۔

ایک ناقد کی حیثیت سے ڈاکٹر خورشید الاسلام اردو کے ادبی حلقوں میں کافی عرصے سے روشناس ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "رگ جاں" انھیں ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جس نے اپنے پرانے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی صلاحیتوں سے کام لینا جانتا ہے۔ خورشید الاسلام روایت کے جاندار عناصر کا شعور رکھتے ہیں اور یہی صفت ان کی شاعری کی مجموعی خصوصیت بھی کہی جا سکتی ہے۔

"رگ جاں" کا نمایاں حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جن میں شاعر کی شخصیت واضح طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ ان غزلوں میں اگر ایک طرف ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا اظہار موجود ہے تو دوسری طرف مروجہ اخلاقی اقدار کے خلاف انفرادی بغاوت کا احساس بھی ملتا ہے۔ زندگی کے حقائق کے بارے میں خورشید الاسلام کا ردعمل ایک ایسے شخص کا ہے جو زمانے کے طور طریقوں کا مخالف ہوتے ہوئے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی صحت اور صداقت پر سختی سے یقین رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس رجحان میں ہمدردی کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ شاعر کے خلوص اور جذبے کی گہرائی سے لگایا جائے گا۔

نظموں میں کئی چیزیں اپنے بیان اور تاثر کے اعتبار سے جدید ذہن کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں کہیں کہیں اشاریت بھی جھلکتی ہے۔ نظم "پیاس" اس کی کامیاب مثال ہے۔

اس دور میں جو لوگ جدت کے تقاضوں کو روایت دشمنی کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں ان کے لیے خورشید الاسلام کا کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعری کا نیا پن روایت سے کنارہ کشی نہیں بلکہ اس کے صحیح شعور پر مبنی ہے۔

(مغیث الرحمٰن)

من سمجھاون

مصنف: شاہ تراب

مرتب: ڈاکٹر سیدہ جعفر

اٹھارویں صدی کے ایک دکنی صوفی شاعر کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت رکھنے والی نظم جو دو سو سال سے مخطوطات کے انبار میں دفن تھی، پہلی بار ہمارے سامنے آئی۔ اس دریافت کے لیے ڈاکٹر سیدہ جعفر ہندوستانی تہذیب اور اردو ادب کے مورخوں کے شکریے کی مستحق ہیں اس لیے کہ انھوں نے ہماری مشترکہ تہذیب کی ایک ایسی کڑی ڈھونڈ نکالی ہے جس کے بغیر اردو کے سیکولر مزاج اور انسان دوستی کی روایت تشنۂ تکمیل رہتی۔ شاہ تراب میر، سودا، درد اور مرزا مظہر جانجاناں کے ہم عصر ہیں۔ ان کے زمانے تک اردو شاعری تشکیلی دور سے گزر کر اس منزل تک پہونچ چکی تھی جب آوازوں اور لہجوں کی انفرادیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ شاہ تراب اگرچہ اب تک ایک غیر معروف شاعر رہے ہیں لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لہجہ اور ان کے موضوعات ہماری شاعری کے ایک ایسے رخ کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی اب تک کچھ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ عام طور پر اردو شاعری پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ہندوستانیت کی کمی ہے، اگرچہ اس اعتراض کو دفع کرنے کے لیے ہمارے پاس محمد قلی قطب شاہ، نظیر، انشا اور گجرات و دکن کے قدیم صوفی شعرا کا کلام موجود تھا لیکن اب ہم ایک ایسے شاعر کے کلام سے روشناس ہوئے ہیں جس کے یہاں ہندو اور مسلم رام اور رحیم کی دوئی مٹتی ہی نہیں ہے

صفت کرا دل اس کی جو رام ہے گا
اسی رام سوں ہم کو آرام ہے گا
ایک نام اللہ نرنجن ہر کا ہے
نرنکار نرگن دو پر ملیسر کا ہے

عام طور پر سب ہی اردو شاعر حمد سے اپنی مثنوی یا نظم کا آغاز کرتے ہیں، لیکن حمد کا یہ انداز جرأت مندانہ بھی ہے اور مذہبوں کے امتزاج کا ثبوت بھی ہماری مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھانے میں صوفیا اور بھگتوں نے جو اہم کام انجام دیے ہیں ان کے ذکر کے بغیر ہم اپنے تہذیبی کردار کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اب اس راہ میں شاہ تراب کا نام ایک اہم سنگ میل کی طرح یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے مہاراشٹر کے مقبول عام سنت کوی: اس رام کی مشہور تصنیف "منا چے شلوک" کی بنیاد پر اپنی نظم "من سمجھاون" لکھی ہے۔ رام داس اپنی وسیع النظری اور صلح کل مشرب کی وجہ سے ہر مذہب و ملت میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی تصنیفات کا اثر شاہ تراب پر کافی نمایاں ہے انھوں نے "منا چے شلوک" کے علاوہ "داس بودھ" سے بھی اپنی اس نظم میں اثر قبول کیا ہے۔ وہ رام داس کے سلسلے کے دوسرے سنتوں کیشو سوامی اور بھیما سوامی کو بھی اپنا ہم مشرب جانتے ہیں۔ ان سنتوں سے ان کے شخصی مراسم بھی کافی پرخلوص تھے۔ شاہ تراب چشتی سلسلے میں بیعت تھے، چشتی سلسلہ ہمارے ملک کی تاریخ میں جس روحانی اور مذہبی اتحاد

کا علمبردار رہا ہے شاہ تراب اس کے مکمل نمائندے نظر آتے ہیں۔ جو لوگ تصوف کو خالص اسلامی نظریہ سمجھتے ہیں اُن کو دارا شکوہ کے علاوہ شاہ تراب ایسے صوفیوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے جنھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کا مذہب انسانیت اور خدا پرستی ہے۔ ان کا خدا مختلف مذاہب کی اصطلاحات اور جھگڑوں سے ماورا ہے شاہ تراب ہندوستانی تصوف اور یکجہتی کی مشترکہ روایات کے پروردہ اور علمبردار ہیں۔ اگر ایسے شاعروں کا اور کلام ڈھونڈ کر اسے تحقیق کی روشنی میں سامنے لایا جائے تو یہ ملک تہذیب اور ادب کی ایک قابل قدر خدمت ہوگی۔ آج "قومی یکجہتی" کا نعرہ ہمارے یہاں سیاسی نعرہ بن گیا ہے لیکن تہذیبی اور مذہبی سطح پر ہمارے روشن خیال صوفیوں اور سنتوں نے اسے آج سے کئی صدی پہلے ہی ایک حقیقت بنا دیا تھا۔ اگر ہماری سیاست اور قومی جدوجہد ان روایات سے آشنا ہوتی اور ان کے سائے میں پروان چڑھتی تو شاید آج ہمیں تعصب، تنگ نظری فرقہ پرستی اور مذہبی تفرقہ اندازی کے تہذیب فرسا مسائل سے دوچار ہی نہ ہونا پڑتا۔

شاہ تراب کی اس نظم کے چھ مخطوطات کا مقابلہ کرکے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بہت محنت اور دقت نظر سے "من سمجھاون" کو ترتیب دیا ہے یہاں بعض محققین کی ان غلطیوں کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا جن سے مرتب کو دوچار ہونا پڑا۔ سالار جنگ لائبریری میں "من سمجھاون" کا جو نسخہ ہے اس کا نام نصیر الدین ہاشمی نے فہرست مخطوطات میں "علی نامہ" درج کیا تھا، اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ "من سمجھاون" کا یہ مذکورہ بالا مخطوطہ اس بند سے شروع ہوتا ہے جس میں حضرت علی کی مدح کی گئی ہے کہ

کشن جس کو کہتے علی نام ہے گا

اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد کی وضاحتی فہرست میں اس نظم کا نام "دوازدہ بحر یا بارہ بحر" لکھا گیا ہے۔ اسی کتب خانے کے دوسرے مخطوطے کا نام "کلام تراب" بتایا گیا ہے۔ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں مصنف کا نام "حسینی برہمن" درج کیا گیا ہے کیونکہ شاہ تراب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

حسینی برہمن اپنے نام داری

ان غلط بیانیوں سے ہمیں مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے والوں کی غیر ذمہ داری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ پورے مخطوطے کا مطالعہ کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے اور اگر ایک ہی کتاب کے دو مختلف مخطوطے ہوں تو بغیر کسی کاوش کے انھیں دو الگ کتابیں مان لیتے ہیں۔ سیدہ جعفر نے محققین کی ان گمراہ کن رہبریوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا اور ایک دیانت دار محقق کی طرح سنی سنائی غیر ذمہ دارانہ باتوں پر اعتبار کرنے کے بجائے خود ہر مخطوطے کے مطالعے اور دوسرے نسخوں سے اس کے موازنے کی زحمت اٹھائی اس لیے ان کا مرتب کیا ہوا "من سمجھاون" کا یہ متن ایڈیٹنگ کے ایک اعلیٰ نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سیدہ جعفر نے صرف نظم کی ایڈیٹنگ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پوری محنت سے مختلف ماخذوں کی چھان بین کرکے شاہ تراب کی زندگی اور ان کی تصنیفات کا ایک مستند خاکہ بھی پیش کیا ہے انھوں نے رام داس اور ان کے سلسلے کے دوسرے سنتوں کے متعلق بھی ضروری مواد فراہم کر دیا ہے۔ اور آخر میں ہندو فلسفے کی ان اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی دے دی ہے جنھیں شاہ تراب نے اپنی نظم میں جا بجا استعمال کیا ہے۔ اس فرہنگ سے کتاب کی افادیت اور بڑھ گئی ہے کیونکہ شاہ تراب کی اصطلاحات بڑی حد تک ہندو دی ہیں۔ یہ بھی ان کے تصوف کی ایک منفرد خصوصیت ہے جو خود تصوف کے علما و محققین کو نئے نقطۂ نظر سے کام کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ہماری تحقیق کا ایک بنیادی اور ضروری کام یہ ہے کہ اہم شاعروں کے وہ دیوان اور نظمیں جو اب تک مستند متن کے ساتھ شائع نہیں ہوئیں انھیں ترتیب دے کر شائع کیا جائے سیدہ جعفر اس سے پہلے ماسٹر رام چندر کے حالات و مقالات کا مستند ایڈیشن شائع کر چکی ہیں اور اب انھوں نے اپنی اس تحقیق سے اس ضرورت کی تکمیل کی طرف دوسرا قدم اٹھایا ہے سیدہ جعفر نے اپنے اس تحقیقی کارنامے سے ہماری تہذیبی اور ادبی تاریخ کی ایک ضروری کڑی فراہم کر دی ہے۔ ہم اُن سے بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ وہ شاہ تراب کی دوسری تصنیفات کے بھی مستند ایڈیشن شائع کریں گی کیونکہ اس کتاب کے مطالعے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ تراب کی اہمیت صرف تاریخی نہیں بلکہ وہ شاعرانہ علمی اور تہذیبی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔

اس کتاب کو ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ کتاب عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے ضروری اور تحقیق کا شوق رکھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ ہمارے ادب کا کوئی مورخ اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(وحید اختر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور نذیر حسن پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا